محمد مظہر الدین صدیقی

# مقامِ انسانیت

## (۳)

(سلسلہ کے لئے دیکھئے ثقافت فروری ۱۹۵۶ء)

مادیات اور روحانیات دونوں میں یہ قانون یکساں جاری ہے کہ انسان جب کبھی رکاوٹ، کسی شر، نقص یا ظلم کو رفع کرنے کی کوشش کرتا ہے تو صرف یہی نہیں ہوتا کہ وہ رکاوٹ نقص، یا شر دور ہو جائے اور معاملہ برابر سرابر ہو جائے بلکہ مادی اور روحانی مزاحمتوں پر غالب آنے سے انسان میں ایک زاید قوت وصلاحیت پیدا ہوتی ہے۔ جو اس نقص کی تلافی کر دینے کے علاوہ اسے مادی یا روحانی ترقی کی راہ میں چند قدم اور آگے بڑھا دیتی ہے۔ اس طرح شر کو دفع کرنے کے ساتھ ہی وہ ایجابی خیر کے حصول پر قادر ہو جاتا ہے۔ مختصر یہ کہ اختیار انسانی ایک ایجابی طاقت خیر ہے اور اس میں شر کے دفع کرنے کی قوت موجود ہے۔ اس لئے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ انسان کو اختیار دے کر قدرت الٰہی نے دنیا میں بدی اور شر کا دروازہ کھول دیا۔

جہاں تک تقدیر کے مروجہ مفہوم کا تعلق ہے اس کے متعلق یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ اسے قرآن کے مفہوم تقدیر سے کوئی نسبت نہیں۔ قرآن میں جہاں جہاں لفظ قدر استعمال ہوا اس کے معنے اس سے بہت مختلف ہیں جو آج کل سمجھے جاتے ہیں مثلاً قرآن کہتا ہے:-

الذی خلق فسوّیٰ والذی قدّر فهدیٰ (۸۷-۲)

جس نے انسان کو پیدا کیا پھر اس کی تعدیل کی اور جس نے اندازہ لگایا اور پھر ہدایت دی۔

والقمر قدّرناه منازل حتی عاد کالعرجون القدیم (۳۶-۳۹)

اور ہم نے چاند کے منازل کا اندازہ لگایا یہاں تک کہ وہ ایک پرانی شاخ کی مانند اپنے پہلے مقام پر واپس آگیا۔

وان من شیء الا عندنا خزائنه وما ننزله الا بقدر معلوم (۱۵-۲۱)

اور ہمارے پاس ہر شے کے خزانے ہیں لیکن ہم اس میں سے صرف ایک مقررہ اندازہ کے مطابق اتارتے ہیں۔

ان مجمول آیات میں لفظ قدر، اندازہ کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ اس لئے تقدیر کو زیادہ سے زیادہ خدا کا اندازہ کہا جا سکتا ہے نہ اس کے یہ معنے نہیں ہو سکتے کہ آدمی کے اعمال کا تفصیلی نقشہ پہلے سے بنا بنایا موجود ہے اور اس

ماضی - حال اور مستقبل ازل سے متعین کیا جا چکا ہے کیونکہ تقدیر کا یہ مفہوم انسانی اختیار کو باطل کر دیتا ہے اور اس کے ساتھ اس کی جزاو سزا کا تصور بھی باطل ہو جاتا ہے - اگر ہمارے اعمال تخلیق عالم سے پہلے مقرر ہو چکے ہیں اور ہم اپنی اخلاقی اور مادی قسمت کی تعمیر پر بالکل قادر نہیں تو ہماری حیثیت صرف مشین کے کل پرزوں کی رہ جاتی ہے - جن کو حرکت دینے والا کوئی اور ہاتھ ہے - اس تصور کے ساتھ ساری مذہبی تعلیم و تبلیغ نیکی کی دعوت ترک گناہ کی تحریص و ترغیب اور پاداش عمل کی وعید بیکار ہو جاتی ہے - تقدیر کے معنے یہ نہیں کہ خدا کے یہاں انسان کے اعمال کا تفصیلی نقشہ پہلے سے مرتب کردہ موجود ہے بلکہ اس کا مطلب صرف اتنا ہے کہ جن مادی نفسی اور روحانی قوانین کے تحت اعمال انسانی سرزد ہوتے ہیں اور جن اصولوں کے مطابق انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی تشکیل پاتی ہے ان کے تعین میں انسان کا کوئی دخل نہیں بلکہ وہ خدا کے مقرر کردہ ہیں - انسان کا کام یہ ہے کہ وہ ان قوانین کو سمجھے اور ان کے مطابق اپنی زندگی بسر کرے - یہی وجہ ہے کہ جن قوموں نے مادیات اور اجتماعیات کے قوانین کو سمجھا اور ان کے مطابق عمل کیا وہ آج دنیا میں ان قوموں کی بہ نسبت زیادہ خوشحال ہیں جنہوں نے نہ قوانین مادی کو سمجھا اور نہ قوانین روحانی کو کیونکہ روحانیت کو مادیت سے الگ قرار دینا بھی وحدت عالم کے بنیادی قانون کی غلط فہمی کا نتیجہ ہے - اس لئے جن قوموں نے خالص روحانیت کا راستہ اختیار کیا انہوں نے ایک زبردست قانون الٰہی سے انحراف کیا - جس طرح خالص مادیت غلط ہے اسی طرح خالص روحانیت بھی ایک وہم باطل ہے - کائنات خلقت میں کوئی ایسی شے نہیں جس کا دیگر اشیا سے بالکل کوئی تعلق نہ ہو - انسانی اور مادی زندگی متعلقات کے ایک وسیع سلسلہ میں جکڑی ہوئی ہے - بعض اشیا کا دوسری اشیا سے قریبی تعلق ہے اور بعض کے تعلقات میں دوری ہے لیکن کوئی شے دوسرے سے بالکل غیر منقطع نہیں - یہی حالت جسم اور روح کی بھی ہے یہ دونوں آپس کے فعل و انفعال سے قائم ہیں - اسی لئے روحانی صحت کے لئے جسمانی صحت کا وجود بھی ضروری ہے اور ایک اعلےٰ طرز کی روحانیت اس معاشرہ میں نہیں پیدا ہو سکتی جو مادی اور اجتماعی نقطۂ نظر سے کمزور ہو - ایک ایسا ملک جو سیاسی ابتری معاشی بدحالی طبقاتی امتیازات اور دیگر اجتماعی مفاسد میں مبتلا ہو روحانی اعتبار سے بھی پسماندہ رہے گا - اس کے افراد کی اخروی نجات بھی اسی طرح معرض خطر میں رہے گی جس طرح ان کی دنیوی نجات - اسی طرح مادی ترقی بھی اخلاقی ترقی کے ساتھ وابستہ ہے - جن قوموں اور تہذیبوں نے مادی اعتبار سے عروج حاصل کیا ہے - انہوں نے محض سائنس علوم و فنون صنعت و حرفت اور صنعتی وسائل کی قوت سے کائنات خارجی کی تسخیر نہیں کی بلکہ آپس کے نظم و ضبط باہمی رواداری اور اجتماعی تعاون کی اہمیت کو سمجھا - جمہوری ادارے پیدا کئے - اپنی حکومتوں پر دستوری پابندیاں لگائیں - حلیہ کو عالم کے اثر سے آزاد کیا - طبقاتی امتیازات - مذہبی اور معاشی اجارہ داریوں کو توڑا غرضکہ پہلے ایک عادلانہ سوسائٹی کی بنیاد ڈالی - پھر اس کے نتیجہ میں انہیں اپنے مادی وسائل سے صحیح طور پر استفادہ کرنے کا موقع ملا - اس سے معلوم ہوا کہ انسان کی اجتماعی اور انفرادی زندگی ایک دوسرے سے الگ اور منقطع نہیں کہ فرد محض اپنی روحانیت کے ذریعے سے اعلیٰ ترین اخلاقی مدارج تک پہنچ سکے فرد کی اخلاقیات جماعت کی عام اخلاقی حالت پر موقوف ہے - پھر جس طرح اجتماعی

اور انفرادی زندگی کو ایک دوسرے سے منقطع نہیں کیا جا سکتا اسی طرح اجتماعی زندگی کی مختلف شاخوں کو بھی قائم بالذات اور مستقل حیثیت نہیں دی جا سکتی کیونکہ ان مختلف شاخوں کا ایک دوسرے پر عمل اور ردِ عمل ہونا ضروری ہے۔ اخلاقیات معاشیات۔ سیاسیات اور روحانیات سب دائرے ایک دوسرے میں گھستے ہوئے اور باہم وابستہ و پیوستہ ہیں۔ ان کو ایک دوسرے سے الگ کر کے دیکھنا وحدتِ حیات کی نفی کرنا ہے۔ اس کے معنے یہ نہیں کہ ان کے اندر کوئی انفرادی یا ذاتی قوت یا ان کا کوئی مخصوص انداز کار اور قانون نہیں۔ لیکن ان میں باہمی تعلق ضرور ہے جس کو نظر انداز کر دینے سے بڑی پیچیدگیاں پیدا ہو سکتی ہیں کیونکہ جیسا کہ ہم پہلے بتا چکے ہیں وحدت و کثرت دونوں حقیقی ہیں اور انسان کے نظامِ حیات میں دونوں کو واجبی اہمیت حاصل ہونی چاہیئے۔ اقوامِ سابقہ نے وحدت کے تصور پر مبالغہ آمیز حد تک زور دیا اور کائنات کے امتیازات تقسیم پذیری اور شعبہ جاتِ عمل کی امتیازی داخلی اور ذاتی قوت کو نظر انداز کر کے دنیا کو ایک بے رنگ وحدت میں تبدیل کرنے کی کوشش کی۔ موجودہ زمانہ میں کثرت اور امتیازات پر ناواجبی حد تک زور دیا جا رہا ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ شعبہ جاتی تقسیم بڑھتی جا رہی ہے۔ علوم و فنون کا باہمی تعلق ختم ہو گیا ہے۔ قوموں میں نئے نئے امتیازات اور تفرقے پیدا ہوتے جا رہے ہیں۔ روحانیت سیاست سے بے دخل ہو گئی ہے۔ معاشیات کو ایک مستقل قوت فرض کر لیا گیا ہے۔ اور شعبہ جاتی مہارت اس درجہ ترقی کر گئی ہے کہ ماہرین فن وسعتِ نظر اور وسعتِ قلب سے محروم ہوتے جاتے ہیں اور ان میں ایسا خطرناک یک رخا پن پیدا ہوتا جاتا ہے جو اقدارِ انسانی اور وحدتِ حیات کے لئے مہلک ثابت ہو سکتا ہے۔ وحدت اور کثرت کی متناسب آمیزش کے بغیر انسان ارتقائے حیات کی مزید منزلیں طے نہیں کر سکتا۔ انسانی کثرت اور الٰہی وحدت دونوں یکساں حقیقی ہیں۔ خدا کی قدرتِ کاملہ سے اختیارِ انسانی کی نفی لازم نہیں آسکتی۔ دونوں اپنی اپنی جگہ پر مستقل حقیقتیں ہیں۔

قرآن نے خدا کے بالمقابل انسان کو ذلیل اور پست و خوار قرار دینے کے بجائے اس کی عظمت اور عزت اس کے احترام اور رفعت کا ایسا شاندار تصور پیش کیا جس کی مثال پیش کرنے سے ادیانِ سابقہ بالکل عاجز ہیں۔ انسان کے خلیفہ الٰہی ہونے کا تصور کسی اور مذہب میں نہیں ملتا لیکن قرآن نے انسان کو زمین پر خدا کا نائب قرار دے کر اس کو کائنات میں ایک ایسا درجہ عطا کیا جو اس سے پہلے اس کو حاصل نہ تھا۔ نیابتِ الٰہی کا تصور انسانی اختیار کے حقیقی ہونے کی سب سے بڑی دلیل ہے کیونکہ ایسا نائب جو بالکل بے اختیار۔ بے بس اور عاجز ہو اپنے فرائض نیابت ادا کرنے کی اہلیت نہیں رکھ سکتا۔ یہ صحیح ہے کہ نائب کے اختیارات محدود ہوتے ہیں لیکن جن حدود میں اسے اختیار دے دیا جاتا ہے ان میں کوئی مداخلت نہیں ہوتی۔ اگر ایک حاکم اپنے نائب کے اختیارات میں مداخلت کرتا رہے تو اس کی حاکمیت اور نائب کی نیابت دونوں کی حقیقت مشکوک ہو جاتی ہے۔ اس لئے خلافت کا تصور اس حقیقت پر دلالت کرتا ہے کہ جن حدود میں [illegible] الٰہی نے انسان کو آزادی اور اختیار تفویض کر دیا ہے ان میں انسان واقعتاً اور حقیقی معنوں میں آزاد و خود مختار ہے۔

یہ تصور بالکل غلط ہے کہ:۔

ناحق ہم مجبوروں پر تہمت ہے خود مختاری کی جو چاہیں سو آپ کریں ہم کو عبث بدنام کیا۔

قرآن نے انسان کو صرف نیابت الٰہی کا شرف ہی عطا نہیں کیا بلکہ اس کو خدا کا مددگار، معاون اور دوست بھی قرار دیا۔ چنانچہ قرآن میں خدا انسان کی اعانت بھی طلب کرتا ہے۔

یا ایھا الذین آمنوا ان تنصروا اللہ ینصرکم و یثبت اقدامکم (۴۷-۷)

اے ایمان والو اگر تم اللہ کی مدد کرو گے تو وہ تمہاری مدد کرے گا اور تمہیں ثابت قدمی عطا کرے گا۔

من ذا الذی یقرض اللہ قرضا حسنا فیضٰعفہ لہ اضعافا کثیرۃ (۲-۲۴۵)

اور کون ہے جو اللہ کو قرض حسنہ دے گا پھر اللہ اس کے قرض کو کئی گنا زیادہ کرکے واپس کرے گا۔

انسان کے شرف و امتیاز کی اس سے بڑھ کر اور کیا دلیل ہوگی کہ خدا اپنے مقاصد میں اسے معاون و مددگار بناتا ہے اس سے قرض طلب کرتا ہے اور اس کی نصرت و تائید کا وعدہ کرتا ہے اس کے معنی یہ ہیں کہ کائنات میں حصولِ خیر اور طلب اقدار کی جدوجہد کا سرا ایک طرف تو انسان سے ملتا ہے اور دوسری طرف خدا سے۔ گویا کہ عالم روحانی اور حیاتِ اخلاقی، انسان اور خدا کے باہمی تعاون سے استوار ہیں۔ ہم نے اس سے قبل بتایا تھا کہ شر اور بدی کے ارتکاب میں تو انسان بالکل آزاد و خود مختار ہے لیکن حصولِ خیر کی جدوجہد میں وہ معاونت الٰہی کا محتاج ہے۔ قرآن کی ان دونوں آیتوں کا یہی مفہوم ہے کہ نصرتِ الٰہی کے بغیر انسان اپنی تعمیری جدوجہد میں کامیاب نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح انسانوں کی جدوجہد اور شرکت کے بغیر اقدار خیر کی کامیابی بھی ممکن نہیں۔ کیونکہ عالم کے تمام اخلاقی تغیرات اور روحانی انقلابات انسانوں کی کوشش اور جدوجہد سے معرض وجود میں آتے ہیں۔ خدا جو کام کرنا چاہتا ہے اس کا ذریعہ وہ انسان ہی کو بناتا ہے۔ اسی حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے قرآن کہتا ہے:۔

ولولا دفع اللہ الناس بعضھم ببعض لفسدت الارض (۲-۲۵۱)

اگر اللہ بعض انسانوں کو دوسرے انسانوں کے ذریعہ دفع نہ کرتا تو زمین پر فساد پھیل جاتا۔

اذن للذین یقاتلون بانھم ظلموا و ان اللہ علی نصرھم لقدیر الذین اخرجوا من دیارھم بغیر حق الا ان یقولوا ربنا اللہ ولولا دفع اللہ الناس بعضھم ببعض لھدمت صوامع و بیع و صلوٰت و مسٰجد یذکر فیھا

ان لوگوں کو لڑنے کی اجازت دی جاتی ہے جن کے خلاف جنگ کی گئی۔ کیونکہ ان پر ظلم کیا گیا ہے اور اللہ ان کی مدد پر قادر ہے۔ ان لوگوں کو جنہیں ان کے گھروں سے ظلماً نکالا گیا اور محض اس لئے کہ وہ اللہ کو اپنا رب قرار دیتے ہیں اور اگر اللہ بعض انسانوں کو دوسرے انسانوں کے ذریعہ دفع نہ کرتا تو گرجا گھر اور عبادت گاہیں اور مسجدیں جن

اسم اللہ کثیراً ولینصرنّ اللہ
من ینصرہ ان اللہ لقوی عزیز (۲۲-۴)

میں کثرت سے خدا کا ذکر کیا جاتا ہے مسمار کر دی جائیں
اور اللہ ان لوگوں کی مدد کرتا ہے جو اس کی مدد کرتے
ہیں اور اللہ قوت والا اور ارادہ کا پکا ہے۔

ان آیات میں انسانی زندگی کے سیاسی معاشی اور سماجی انقلابات کا پورا فلسفہ بیان کر دیا گیا ہے اور ان سے معلوم ہوتا ہے کہ اخلاقی تغیرات میں انسان بھی ایک عامل اور موثر ہستی ہے نیز حصول اقتدار اور ارتقائے حیات کا عمل انسانی جماعتوں اور گروہوں کی باہمی کشمکش میں صورت پذیر ہوتا ہے اور وہ اس طرح کہ جو گروہ انسانی برتر مقاصد اور اعلیٰ تر اقدار پر اپنی جدوجہد کی بنیاد رکھتا ہے اسے خدا کی نصرت حاصل رہتی ہے۔ کیونکہ جیسا قرآن کے الفاظ سے ظاہر ہوتا ہے مقاصد اعلیٰ کو تقویت دینا دراصل اغراض الٰہی کی تکمیل کرنا ہے اور ان مقاصد کے لئے تگ و دو کرنا مرضی الٰہی کی اطاعت ورزی کرنا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اعلیٰ مقاصد اور اقدار کی کوشش میں خدا انسان کا شریک کار رہے۔ اگر دنیا میں ایسا تصادم اور تنازع نہ پیدا ہو اور جماعتوں اور گروہوں کی کشمکش نہ جاری رہے تو انسان کا سیاسی مدنی اور اخلاقی ارتقاء رک جائے اور جیسا کہ قرآن کا بیان ہے زمین پر فساد پھیل جائے۔ بہر صورت تغیرات عالم کا ظہور انسانی جدوجہد کے بغیر نہیں ہوتا اور خدا اپنی مرضی انسان ہی کے ذریعہ پورا کرتا ہے۔ اس لئے انسان واقعات عالم کا ایک ضروری اور موثر عامل ہے۔ نیز خدا کی تائید اور نصرت فوق الفطرت ذرائع سے نہیں آتی بلکہ اس کا عمل بھی نفس انسانی ہے۔ یہ سمجھنا صحیح نہیں کہ اعلاء خیر کے حصول میں انسان کو خدا کی طرف سے جو مدد ملتی ہے اس کا مصدر کہیں خارج میں موجود ہے اور کوئی بیرونی قوت نیکی، حسن عمل اور اقتدار خیر کے حصول میں انسان کی معاون ہوتی ہے۔ خدا کی نصرت متعدد اشکال اختیار کر سکتی ہے لیکن ان سب کا تعلق انسان ہی سے ہے نہ کہ کسی غیر انسانی جماعت سے مثلاً نصرت الٰہی کی ایک شکل یہ ہے کہ جو جماعت بلند مقاصد اور اعلیٰ عزائم کے ساتھ میدان میں آتی ہے اس کے ایمان میں پختگی۔ عمل میں استواری اور اصولوں میں جاذبیت ہوتی ہے اور اسی وجہ سے وہ دوسری جماعتوں کے مقابلہ میں زیادہ ثابت قدم رہتی ہے۔ شر کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اُسے اپنی صداقت اور کامیابی کا یقین کم ہوتا ہے۔ اس کے برخلاف خیر کی طاقت رجائیت پسند اور اپنی صداقت پر ایمان رکھنے کے باعث زیادہ متحرک۔ باعمل۔ ثابت قدم اور استوار ہوتی ہے۔ نصرت الٰہی کی ایک دوسری شکل یہ ہے کہ اعلیٰ تر اقدار کی جاذبیت اور صداقت انسانوں کی زیادہ تعداد کو متاثر کرتی ہے جس کے باعث اس گروہ کے اعوان و انصار بڑھتے جاتے ہیں، جس کے اقدار حیات بہتر ہوں اور اسی نسبت سے مخالفین کی عددی قوت ضعیف ہو جاتی ہے۔ غرضیکہ جن متعدد صورتوں میں نصرت الٰہی کا ظہور ہوتا ہے ان سب کا تعلق انسان کی انفرادی اور اجتماعی نفسیات سے ہے۔ اس لئے اس دائرہ میں بھی دراصل انسان ہی تغیرات عالم کی علت فاعلہ ہے۔ اس مسئلہ میں ساری الجھن اس وجہ سے پیدا ہوتی ہے کہ بالعموم انسان خدا کو ایک خارجی قوت اور ماورائی طاقت

قرار دیتا ہے اور یہ قبول جاتا ہے کہ خدا خود نفس انسانی میں حائل و موثر اور جاری و ساری ہے۔

واعلموا ان اللہ یحول بین المرء وقلبہ — اور جان لو کہ اللہ انسان اور اس کے قلب کے درمیان متحرک ہے (۸-۲۴)

انسان کی تمام اخلاقی آرزوؤں، روحانی امنگوں، اعلیٰ مقاصد، بہتر اقدار اور جذبات لطیف کا محرک خدا ہے۔ ہمارے تمام افکار عالیہ اور اعمال صالحہ کا مصدر بھی وہی ہے۔ اس کی آواز قلب انسانی کی گہرائیوں سے ابھرتی ہے۔ اس کی کرامتوں اور معجزات کا محل خارج میں نہیں انسان کے بطون میں پوشیدہ ہے۔ اس لئے دنیا میں نیکی، حسن عمل، تعمیر و تحسین اور ارتقائے حیات کی جد و جہد جہاں کہیں بھی جاری ہے اس کی تہ میں خدا کا ہاتھ پوشیدہ ہے۔

وما رمیت اذ رمیت ولکن اللہ رمیٰ — اور تم نے ان کو نہیں مارا جب کہ تم نے مارا بلکہ خدا نے ان کو اپنی مار دی۔

اسی طرح بدکاری، تخریب، شر اور فساد کے جتنے عوامل ہیں عرفان الٰہی کے فقدان اور ذات الٰہی سے مہجوری کا نتیجہ ہیں۔ جب انسان اقدار عالیہ کی جد و جہد شروع کرتا ہے اور خصوصی مفادات کے تنگ دائروں سے نکل کر مفاد عامہ کے لئے سینہ سپر ہوتا ہے تو اختیار انسانی کی سرحدیں اختیار الٰہی سے مل جاتی ہیں اور اس میں اتنی زبردست طاقت پیدا ہو جاتی ہے کہ اس کے سامنے کوئی مزاحم قوت نہیں ٹھہر سکتی لیکن جب وہ اپنے محدود اغراض خصوصی مفادات اور ادنیٰ جذبات و خواہشات کی تکمیل میں مصروف ہوتا ہے تب بھی اس کا اختیار اور اس کی آزادی معدوم نہیں ہوتی اور اس کی کوششوں کے جو طبعی نتائج ہونے چاہئیں وہ ضرور برآمد ہوتے ہیں۔ البتہ اس حالت میں اس کے اختیار کو اختیار الٰہی اور اس کی قدرت کو قدرت مطلقہ سے کوئی قوت نہیں پہنچتی۔ وہ اپنے مادی وسائل کے حدود میں محصور ہو جاتا ہے اور کسی مزید اخلاقی قوت و اعانت کا مستحق نہیں رہتا۔

من کان یرید الحیوۃ الدنیا وزینتھا نوف الیھم اعمالھم فیھا وھم فیھا لا یبخسون (۱۱-۱۵)

جو لوگ دنیا کی ادنیٰ زندگی اور لذتیں تلاش کرتے ہیں ہم انہیں ان کے اعمال کے پورے پورے فوائد عطا کرتے ہیں اور ان فوائد میں کوئی کمی نہیں کی جاتی۔

تاریخ عالم میں جتنے بڑے بڑے انقلابات رونما ہوئے ان کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ان میں نصرت الٰہی سرگرم تھی۔ یہ بات صرف دینی تحریکوں کے لئے ہی صحیح نہیں بلکہ تمام تحریکات انسانی پر اس کا یکساں اطلاق ہوتا ہے کیونکہ تاریخ میں جو تحریکیں کامیاب اور موثر ہوئیں ان کی کامیابی اور فتح کا راز یہی تھا کہ وہ ارتقائے حیات میں ممد و معاون تھیں اور ان کی کامیابی کے ساتھ ضعیف، پسماندہ اور محروم طبقات کا مفاد وابستہ تھا۔ اس لئے یہ خیال صحیح نہیں کہ محض خدا کا نام لے لینے، دینی اقدار کو درمیان میں لانے سے ہی کسی مقصد کو غیبی امداد حاصل ہو سکتی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ زندگی کی فطرت میں جذبہ اور

جوش دلاں ہے۔ اس لئے ہر وہ عمل جس سے زندگی ارتقاء کی کسی نئی منزل تک پہنچ سکے۔ اور ہر وہ مقصد جس سے انسانوں کی زیادہ تعداد کا مادی اور روحانی مفاد وابستہ ہو نصرت الٰہی اس کی معاونت کے لئے سرگرم کار رہتی ہے خواہ اس مقصد کے حامل شعوری طور پر دینی اقدار کے حامی ہوں یا بظاہر دین والوں کو ان کو کوئی تعلق نہ ہو۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو دنیا کی غیر دینی اور غیر روحانی تحریکات اور تہذیبیں کبھی سرسبز نہ ہو سکتیں یا کم از کم ان انسانوں پر غالب نہ آسکتیں۔ جو دینی اقدار کے پرستار تھے۔

قرآن نے انسان کو خدا کا معاون و مددگار قرار دے کر اسے جو شرف عطا کیا ہے اس کی مزید توثیق ان آیات سے ہوتی ہے جن میں اچھے انسانوں کو خدا کا دوست کہا گیا ہے۔ چنانچہ قرآن کہتا ہے۔

| | |
|---|---|
| اللہ ولی الذین آمنو یخرجہم من | اللہ ایمان لانے والوں کا دوست ہے اور انہیں تاریکی سے روشنی |
| الظلمت الی النور، والذین کفروا اولیاھم | میں نکالتا ہے اور جن لوگوں نے کفر کیا ان کا دوست شیطان ہے |
| الطاغوت یخرجونھم من النور الی الظلمت | جو انہیں روشنی سے تاریکی میں لے جاتا ہے۔ |

(۲-۲۵۷)

| | |
|---|---|
| الا ان اولیاء اللہ لا خوف علیھم ولا | یاد رکھو کہ اللہ کے دوستوں کے لئے نہ تو خوف ہے اور نہ حزن |

یحزنون (۱۰-۶۲)

اسی طرح جو گروہ اقدار باطلہ اور مقاصد سیئہ کے لئے جدوجہد کرتا یا ایسی جدوجہد کی معاونت کرتا ہے قرآن اس کو شیطان کا دوست قرار دیتا ہے۔

| | |
|---|---|
| الذین آمنو یقاتلون فی سبیل اللہ والذین | جو لوگ ایمان لائے وہ اللہ کے راستہ میں لڑتے ہیں اور جن لوگوں نے |
| کفروا یقاتلون فی سبیل الطاغوت فقاتلوا اولیاء | کفر کیا وہ شیطان کی راہ میں لڑتے ہیں۔ اس لئے تم شیطان کے |
| الشیطان ان کید الشیطان کان ضعیفا | دوستوں سے لڑو اور یاد رکھو کہ شیطان کی تدابیر بہت کمزور |

(۴-۷۶) ہیں۔

اگر اسلام کا خدا اتنا ماورائی ہوتا جتنا کہ مخالفین اسلام کا بیان ہے تو قرآن انسان کو خدا کا دوست معاون یا مددگار کبھی نہ کہتا۔ کیونکہ ایک کامل ماورائی ہستی میں دیگر موجودات کے ساتھ غیریت کے سوا اور کوئی نسبت نہیں ہو سکتی اور اگر خدا انسان کے ساتھ مغائرت کلی رکھتا ہے تو وہ انسان کا دوست نہیں ہو سکتا۔ اور نہ اس کی اخلاقی آرزوؤں میں شریک ہو کر اس کے اعلیٰ نصب العین کی معاونت کر سکتا ہے۔ دوست اور دوست کے درمیان کسی قسم کی یگانگت اور مماثلت ضروری ہونی چاہیئے تب جا کر دوستی کا رشتہ قائم رہ سکتا ہے۔ اس لئے خدا اور انسان کا تعلق ایسا نہیں جیسا کہ ایک ماورائی اور بیگانہ عالم خدا کا اس کی بے جان اور بے اختیار مخلوقات سے ہوتا ہے بلکہ خدا ہمارا دوست معاون اور ہادی ہے جو اقدار عالیہ اور اخلاق فاضلہ کی جدوجہد میں

ہماری نصرت اور تائید کرتا ہے۔ البتہ جو افراد یا گروہ ذلیل و پست اغراض و مقاصد کی جد و جہد میں مصروف ہوں ان کے ساتھ خدا کا رشتہ کامل منافرت کا ہو جاتا ہے اور وہ کائنات کی الٰہی قوتوں سے کسی قسم کی نصرت و تائید کے متوقع نہیں ہو سکتے یہ بھی ظاہر ہے کہ اگر انسان کو بالکل بے حقیقت، بے بس اور بے اختیار ہستی تسلیم کر لیا جائے تو پھر اس کو خدا کا دوست قرار دینا بے معنی ہو جاتا ہے۔ کیونکہ دو ایسی ہستیوں میں تعاون اور رفاقت کے رشتہ کا تصور نہیں کیا جا سکتا جن میں سے ایک تو فاعل حقیقی ہو اور دوسرا محض اس کا آلۂ کار۔ دوستی کا سارا تصور اس مفروضہ پر مبنی ہے کہ دو ہستیاں اپنی آزاد مرضی اور انتخاب ذاتی سے محض مذاق و میلان اور اقدار و مقاصد کی ہم آہنگی کے باعث ایک دوسرے کی شریک و معاون ہوں۔ ورنہ اگر ان میں سے کوئی ایک دوسرے کے قہر و طاقت سے مجبور ہو کر اس کے ساتھ رفاقت اور معاونت کا تعلق پیدا کرے تو ہم صحیح معنوں میں اسے دوستی کا رشتہ قرار نہیں دے سکتے۔

ہمارے وحدت الوجودی صوفیا نے خدا کے عام ماورائی تصور سے بیزار ہو کر ایک زبردست فکری بغاوت کا آغاز کیا جس کے نتیجہ میں کائنات اور خدا کے مابین اتحاد کامل کا تصور پیدا ہو گیا اور کامل غیریت کی جگہ کامل عینیت نے لے لی۔ اس طرز فکر سے دو منطقی نتیجے پیدا ہوئے۔ کہیں تو انسانیت اور الوہیت کی تمیز ہی اٹھ گئی اور انسان کو خدا سمجھا جانے لگا۔ چنانچہ ہمہ اوستی نظر یا حلول کے عیسائی تصور کی شکل میں یہ نظریہ ایک محدود حلقہ میں مقبول رہا۔ پھر بھی فہم عامہ کے لئے یہ نظریہ کسی قدر دقیق اور پیچیدہ تھا۔ انسان کو خدا سمجھنا اتنا آسان نہیں جتنا خدا کے مقابلہ میں انسان کو ہستی باطل قرار دینا۔ اس لئے انسان اور خدا کی عینیت کا تصور بالآخر انسان کی حقیقت کے انکار کی طرف لے گیا۔ کثرت کو فریب محض سمجھا گیا اور خدا ایک ایسی وحدت مطلقہ میں تبدیل ہو گیا جس کے مقابل انسان اور کائنات کا وجود اعتباری اور غیر حقیقی ہے۔ پھر جب انسان کا وجود ہی معرض خطر میں پڑ گیا تو اس کے شرف و امتیاز اور اختیار و آزادی کا کیا سوال ہو سکتا تھا لیکن ذہن عامہ کے لئے یہ تصور کرنا بھی دشوار تھا کہ انسان کا وجود بالکل غیر حقیقی ہے۔ اس لئے وحدت الوجودی نظریہ بالآخر اس عقیدہ میں متشکل ہوا کہ کائنات ایک سراب نظر ہے۔ زندگی وہم و خواب ہے اور انسان کا وجود تو ہے لیکن ایک فاعل اور موثر ہستی کے طور پر نہیں بلکہ ایک بے اختیار، مجبور اور بے بس وجود کی شکل میں۔ اس طرح ایک غلو سے دوسرا غلو پیدا ہوا۔ ہم بتا چکے ہیں کہ قرآن کی رو سے زندگی کی اخلاقی جد و جہد میں انسان خدا کا اور خدا انسان کا رفیق، دوست اور معاون و مددگار ہے۔ لیکن یہ رفاقت اور تعاون بغیر اس کے ممکن نہیں کہ دونوں کا وجود حقیقی ہو۔ اگر ان میں سے کوئی ایک بے حقیقت، بے اختیار اور غیر موثر ہو تو رفاقت و تعاون کا یہ سارا تصور باطل ہو جاتا ہے۔ کامل غیریت کے انکار سے کامل عینیت تسلیم کرنا لازم نہیں آتا۔ اگر خدا اور انسان بالکلیہ ایک دوسرے کے غیر نہیں تو ضروری نہیں کہ دونوں ایک دوسرے کے عین یا متحد الذات ہوں۔ اگر کثرت کے لئے وحدت کا وجود ضروری ہے تو اس کے یہ معنی نہیں ہو سکتے کہ وحدت ہی حقیقی اور کثرت خیالی ہے۔ اگر خدا اور انسان ایک دوسرے کی ضد نہیں تو اس سے کہاں ثابت ہوتا ہے کہ ان کا [illegible] محو کیا جائے۔ اگر اشیائے عالم تعلقات کے ایک وسیع سلسلہ میں جکڑی ہوئی ہیں اور کوئی شے دوسرے سے یکسر منقطع اور

غیر متعلق نہیں تو اس سے یہ نتیجہ نہیں نکالا جاسکتا کہ یہ سارے تعلقات ایک نوعیت کے ہیں اور ان میں قرب و بُعد کا کوئی تفاوت یا مدارج و مراتب کا کوئی فرق نہیں پایا جاسکتا۔ ایک ہی فرد اپنے مختلف تعلقات کے اعتبار سے بیک وقت دوسروں کا باپ۔ بھائی۔ چچا۔ ماموں۔ دوست اور دشمن ہو سکتا ہے۔ ایک کتاب جو میز پر رکھی ہو اگر کسی طالب علم کے ہاتھ میں آجائے تو اس تعلق کے باعث ایک نئی اضافت اختیار کر سکتی ہے جو پہلی اضافت سے مختلف ہوگی۔ اسی طرح ایک ہی شے متعدد اشیا کے تعلق سے مختلف اضافات اور نسبتیں حاصل کر سکتی ہے۔ وحدت عالم کے اقرار سے اس کے اختلافات و امتیازات کا ساقط الاعتبار ہونا لازم نہیں آتا۔ بے شک وحدت مطلقہ کثرت کی شیرازہ بند ہے اور اس کے بغیر کثرت کا قیام ممکن نہیں لیکن کثرت نہ ہو تو اس وحدت کا وظیفہ کیا رہ جائے گا۔ غرضکہ نہ تو دینی نقطۂ نظر سے اور نہ عقلی نقطۂ نظر سے یہ ثابت کیا جاسکتا ہے کہ خدا اور انسان بالکلیہ غیر یک دگر یا عین یک دگر ہیں یا ان میں سے کوئی بالکل بے حقیقت بے اختیار اور دوسرے کا آلۂ کار ہے۔ اختیار انسانی بھی اپنے حدود میں اتنا ہی حقیقی ہے جتنا اختیار الٰہی۔ خدا کی ماورائی عظمت سے انسانی شرف و امتیاز باطل نہیں ہوتا اور نہ انسان کی عظمت سے عظمت الٰہی کی نفی ہوتی ہے اس کے برعکس عظمت انسانی سے عظمت الٰہی اور زیادہ نمایاں ہو جاتی ہے۔ اگر ایک باپ اپنی اولاد کی ترقی۔ خوشحالی اور کامیابی سے اپنی بزرگی میں کوئی کمی نہیں محسوس کرتا تو انسان کی ترقی خوشحالی اور اضافہ پذیر طاقت سے خدا کی بزرگی اور برتری میں کس طرح کمی واقع ہو سکتی ہے۔ کمال انسانی درحقیقت کمال الٰہی کی دلیل ہے کیونکہ انسان کمال و ارتقاء کی طرف بڑھ نہیں سکتا جب تک اس کا رشتہ خدا سے استوار نہ ہو اور اس کا تہذیبی اور سماجی نظام اپنی صفات و خصوصیات میں صفات الٰہی اور قوانین خداوندی کا عکس نہ ہو۔

اسی حقیقت کو قرآن نے مختلف طریقوں سے بیان کیا ہے۔ کہیں وہ انسان کو خدا کا دوست اور معاون بتاتا ہے اور اعمال انسانی پر آدمی کی دینی اور دنیوی نجات کو موقوف قرار دیتا ہے۔ کہیں وہ اخلاقی جدوجہد اور اجتماعی اصلاح کے تقاضہ سے روشناس کرنے کے لئے انسانوں کو اللہ کی پارٹی (حزب اللہ) اور شیطان کی پارٹی (حزب الشیطٰن) میں تقسیم کرتا ہے غرضکہ اس کا ہر مطالبہ اصلاح انسان سے متعلق ہے اور وہ انسان ہی کو تمام تغیرات اور اصلاحات کی علت فاعلہ قرار دیتا ہے۔ خدا کے متعلق قرآن کا تصور یہ ہے کہ وہ انسانی کوششوں میں بشرطیکہ ان کا مقصد صحیح ہو اور ان کی تہ میں خلائق کی نفع رسانی اور قیام عدل و مساوات کا جذبہ کارفرما ہو آدمی کا معاون و مددگار ہے۔ لیکن انسان کو یہ توقع نہیں کرنی چاہیئے کہ اس کی سعی و تدبیر فکر و کوشش اور آزادی و اختیار کے استعمال کے بغیر محض دعاؤں وظیفوں یا خالی عبادات و ریاضات سے خدا اس کے مقاصد کی تکمیل کرے گا۔ جہاد اور عمل اپنے اجتماعی مفہوم میں قرآن کے دو بڑے اقدار ہیں۔ اس کے نزدیک عالم کی شیرازہ بند قوت کو افراد کی ذاتی اور شخصی تمناؤں سے کوئی دلچسپی نہیں کائنات کی نظم آفرین قوت کا تعلق کثرت کے ساتھ ہے نہ کہ منفرد اشخاص سے کیونکہ اس کا وظیفہ یہی ہے کہ وہ کثرت کو وحدت کی طرف لائے۔ اس لئے وہ افراد سے نہیں

گروہوں اور جماعتوں سے معاملہ کرتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کائنات اپنی رفتار ارتقا میں افراد کی خواہشات اور آرزوؤں کا کوئی لحاظ نہیں کرتی اور نہ اس کو کسی مخصوص قوم و ملت، مذہب، نسل، قبیلہ یا خاندان کی بھلائی سے کوئی دلچسپی ہے

دریا کو اپنی موج کی طغیانیوں سے کام  کشتی کسی کی پار ہو یا درمیان رہے

| | |
|---|---|
| لیس بامانیکم ولا امانی اھل الکتٰب | نہ تمہاری تمناؤں سے کچھ ہوگا اور نہ اہل کتاب کی آرزوؤں |
| من یعمل سوءً یجز بہ (۴-۱۲۳) | سے جو برائی کرے گا اس کو ویسا ہی بدلہ ملے گا۔ |

البتہ اس کو ہر ایسے عمل سے لگاؤ ہے جس سے انتشار کی جگہ نظم اور تفریق کی جگہ اتحاد پیدا ہو۔ خدا خود نظم آفریں ہے اور نظم آفرینی کو پسند کرتا ہے۔ انسانی تعلقات اور نظامات کی کوئی ایسی حالت اسے پسند نہیں آسکتی جس سے باہمی تصادم فساد اور آویزش پیدا ہو یا انسانوں کے تعلقات میں فقدان عدل کے باعث بدمزگی اور تلخی پیدا ہو جس طرح وہ خود اختلافات عالم کی وحدت ہے اسی طرح وہ ہر ایسی انسانی جد و جہد کا معاون ہے جس سے اختلافات انسانی کو مٹائے بغیر انہیں ایک نظم اور وحدت کے تحت شیرازہ بند کیا جا سکے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ہر ایسی بنی بنائی وحدت کا دشمن ہے جس میں ضرر، نقصان اور ظلم و ناانصافی کا پلہ بھاری ہو اور ہر ایسی نئی وحدت آفرینی کا معین و مددگار ہے جس میں انسانی تعلقات کو بہتر اصولوں پر منظم کرنے کا امکان ہو۔ چنانچہ عالم میں پرانی وحدتوں کو شکست و ریخت اور نئی ترقی پذیر وحدتوں کی تشکیل پذیری کا سلسلہ اسی وجہ سے جاری ہے۔

انسان تبدیلی اور ترقی کا کوئی قدم نہیں اٹھا سکتا جب تک اس میں اپنے انسانی شرف و امتیاز اور اختیار و آزادی کا احساس نہ ہو۔ اس لئے جس ملت کے افراد میں اپنی خودی کا شعور نہ ہو، جس قوم کے لوگ احترام انسانی کے جذبہ سے خالی ہوں اور ایک دوسرے کو آگے بڑھانے اور ترقی دینے کے بجائے ایک دوسرے کی تذلیل پر کمربستہ ہوں جس امت کے پیرو اپنی ہستی کو بے حقیقت اور اپنے اختیار کو بے اصل سمجھیں اور انسان کو ایک فاعل اور موثر حقیقت ماننے کے بجائے اس کو جمادات اور نباتات کی مانند مجبور و مقہور خیال کریں جن کی جد و جہد اقدار عالیہ سے عاری اور نصب العین کی بلندی سے بیگانہ ہو جن کے قلوب اعانت الٰہی کی طلب اور خدا پرستی کے جذبہ سے خالی ہوں قدرت ان کے ساتھ ویسا ہی معاملہ کرے گی اور جب انہوں نے اپنے آپ کو عاجز و بے بس اور ایک اندھی بہری تقدیر کا آلہ کار سمجھ رکھا ہے تو خدا بھی انہیں ضعیف و بے چارہ اور شکستہ تقدیر رہنے دے گا اس کے برخلاف جو قومیں آگے بڑھنا چاہیں گی جنہیں اپنی جد و جہد کی نتیجہ خیزی کا اور سعی و تدبیر کی حقیقت پر ایمان ہوگا اور جو ساتھ ہی اپنے معاشرہ اپنی سیاست اور اپنے مذہبی اور دینی نظام کو عدل، بے تعصبی، مساوات انسانی اور احترام آدمیت کے سانچوں میں ڈھالیں گی۔ خدا ان کو اس کوشش کا صلہ مزید عطا کرے گا۔